ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۱ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۶

رجسٹرڈ نمبر 922 ـ ل
فون نمبر ـــ 29

ایڈیٹر
آل احمد سرور

فی کاپی بیس پیسے
قیمت سالانہ چھ روپے

اشاعت کی تاریخیں
۱ ، ۸ ، ۱۵ ، ۲۲ فروری

اداریہ

اردو اکاڈمی اتر پردیش

اتر پردیش کی حکومت نے اردو اکاڈمی قائم کردی ہے۔ اس اکاڈمی کا افتتاح وزیر اعلیٰ نے ۱۰ر جنوری کو کیا اور ۳۰ر جنوری کو اس کی مجلس انتظامیہ کا پہلا جلسہ ہوا۔ اکاڈمی کو ایک خود مختار ادارہ بنادیا گیا ہے اور اسے رجسٹر بھی کردیا گیا ہے۔ اس کے لئے سال رواں میں پانچ لاکھ کی رقم بھی مخصوص کردی گئی ہے۔ اکاڈمی کے صدر تو وزیر اعلیٰ ہیں، مگر انتظامیہ کے صدر اردو کے مشہور شاعر پنڈت آنند نرائن ملا ہیں اور اکاڈمی کے کام کی دیکھ بھال دراصل وہی کریں گے۔ انتظامیہ کے جلسے میں پنڈت آنند نرائن ملا نے اس بات کا یقین دلایا کہ اکاڈمی کے کام میں لال فیتے کو حارج نہیں ہونے دیا جائے گا اور اردو کی بقا اور ترقی کے لئے اکاڈمی اپنے کام میں ترجیحات (PRIORITIES) قائم کرے گی، تاکہ جو کام سب سے ضروری ہیں وہ پہلے ہاتھ میں لئے جاسکیں۔

ظاہر ہے کہ اس مالی سال کی اب دو مہینے سے بھی کم مدت رہ گئی ہے اس لئے ضروری ہے کہ جو روپیہ اکاڈمی کے لئے وقف کیا گیا ہے اس میں سے حسب ضرورت خرچ کے بعد جو بچے وہ اگلے سال کے لئے جمع کردیا جائے۔ ایسا نہ ہونا چاہئے کہ یہ رقم سوخت ہوجائے۔ سرکاری کاموں میں یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سال کی بیشتر مدت میں روپیہ خرچ نہیں ہوتا، مگر آخر زمانے میں الٹا سیدھا خرچ کرکے حساب برابر کرلیا جاتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ترجیحات جلد سے جلد قائم کرلی جائیں تاکہ ان کے مطابق کام شروع ہوسکے۔

ہم یہ برابر کہتے آئے ہیں کہ یوں تو ادیبوں کی ہمت افزائی اچھی کتابوں پر انعامات، کتب خانوں کے لئے اردو کی کتابوں کی خریداری بھی اچھے اور مفید کام ہیں مگر سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اکاڈمی کسی نہ کسی طرح اردو کے ذریعہ سے ابتدائی تعلیم، اردو کے ذریعہ ثانوی تعلیم، ثانوی اسکولوں میں اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کے انتظام پر، سب سے زیادہ توجہ کرے۔ یہ بنیادی کام ہے اس سلسلے میں دل خوش کن اعلانات کافی نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس انتظام کے ہر پہلو پر پورا غور کیا جائے اور جہاں جہاں دشواری یا دقت محسوس ہوتی ہے اسے دور کیا جائے۔ مثلاً استادوں کی جگہوں کی منظوری کافی نہیں۔ اگر قواعد کے مطابق کچھ ایسی شرطیں ہیں جن کو فی الحال پورا نہیں کیا جاسکتا تو عارضی طور پر ان قواعد کو کچھ نرم کردیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو کے ذریعہ پڑھانے والے استادوں کی تربیت کے لئے یا تو نئے نارمل اسکول کھولے جائیں یا موجودہ نارمل اسکولوں میں علحدہ سیکشن ہوں یا استادوں کو اردو کا کوئی امتحان پاس کرنے کے لئے الاؤنس دیا جائے۔ استادوں کے علاوہ کتابوں کی فراہمی کا بھی مسئلہ ہے۔ جو کتابیں حکومت شائع کرتی ہے ان کے یا تو ترجمے یا نئی کتابیں جلد سے جلد تیار کرائی جائیں اور وقت پر مل جائیں۔ ابتدائی تعلیم کے لئے زیادہ کتابوں کی ضرورت نہ ہوگی مگر ثانوی منزل تک کے لئے تمام علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرانا چاہئے یا اردو کی جو کتابیں مختلف علوم کو پڑھانے کے لئے کسی بھی ریاست میں رائج ہیں ان کو فی الحال لے لینا چاہئے ایک خاص چیز جو ثانوی اسکولوں میں اردو کے ذریعہ سے تعلیم میں حارج ہوتی ہے وہ یو۔پی بورڈ کے کچھ قواعد کی کوتاہی ہے۔ بورڈ بظاہر ہائی اسکول

اور انٹرمیڈیٹ میں اردو کے ذریعہ جوابات کی اجازت دیتا ہے، مگر عملی طور پر اس اجازت کے حاصل کرنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ پھر جن لوگوں کو اجازت مل جاتی ہے ان کی کاپیاں ایسے لوگوں کے پاس جاتی ہیں جو اردو سے نابلد ہوتے ہیں۔ اس لئے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ بورڈ کے قواعد میں مناسب ترمیم کی جائے، دوسرے اس کا لحاظ رکھا جائے کہ ممتحن اردو بھی جانتا ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ جب اس قسم کی کوئی دقت سامنے آتی ہے تو حکومت ایک عمومی دل خوش کن اعلان کر دیتی ہے، مگر چونکہ متعلقہ اداروں کے قواعد میں مناسب گنجائش نہیں نکالی جاتی اس لئے جس سہولت کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ کاغذ پر رہتی ہے۔ اکاڈمی کا خاص کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایسے سارے مسائل کا غائر نظر سے مطالعہ کرے ان کی عملی دشواریوں کی تہ تک جائے اور حکومت سے ایسے انتظامات کرائے کہ جو سہولتیں اردو والے چاہتے ہیں اور جن کے دینے کے لئے حکومت بھی آئے دن اعلان کرتی رہتی ہے، وہ محض کاغذ پر نہ رہیں، بلکہ ہر شعبے میں اور ہر منزل پر ان پر عمل ہو۔

حکومت کے اعلان کے مطابق اکاڈمی کے بجٹ میں ایک لاکھ کی رقم اردو کے مصنفین کی تخلیق میں ہمت افزائی کے لئے، ایک لاکھ کتب خانوں اور دارالمطالعوں کے لئے اردو کی کتابیں، اخبار اور رسالے خریدنے کے لئے اور تین لاکھ کی رقم اکاڈمی کے دوسرے اخراجات کے لئے مختص کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حد بندی مناسب نہیں، دراصل حکومت کو چاہئے تھا کہ اکاڈمی کو خود ہر مد کے لئے رقم متعین کرنے کا اختیار ہوتا، حکومت صرف ان مدوں کی صراحت کر دیتی۔ اگلے بجٹ میں پوری رقم اکاڈمی کو دے دینا چاہئے تاکہ وہ ہر مد پر جو مناسب سمجھے خرچ کرے۔ ظاہر ہے کہ دفتر کے اخراجات کم سے کم رکھنے چاہئیں تاکہ زیادہ سے زیادہ روپیہ ان مفید کاموں پر خرچ ہو سکے جو اکاڈمی کے کرنے کے ہیں۔

آزادی کے بعد اترپردیش کی حکومت نے اپنی لسانی پالیسی ایسی رکھی کہ پچیس برس میں اردو کو ہر طرح اور ہر منزل پر نظر انداز کیا گیا۔ یہ اردو کا ہی نہیں اترپردیش کا بھی نقصان ہوا۔ اب اگر حکومت اس نقصان کی تلافی کرنا چاہتی ہے تو ابتدائی اور ثانوی منزل پر اردو کے ذریعہ تعلیم کے لئے واقعی اور حقیقی انتظام جلد سے جلد ہونا چاہئے۔ برسوں کی مدولی کے بعد عام اردو داں طبقہ اتنا مایوس ہو گیا ہے کہ وہ شکایات بھی نہیں کرتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ان پر کوئی توجہ نہ ہو گی، اس لئے سچے جمہوریت پسند اور محب وطن حضرات کا فرض یہ ہے کہ وہ اس صورت حال کا جائزہ لے کر جلد سے جلد موثر قدم اٹھائیں اور اردو کی تعلیم کا سب سے پہلے انتظام کریں، پھر اردو کے چلن کے سلسلے میں جو دشواریاں ہیں ان کو دور کرائیں اس کے بعد ادب کی ہمت افزائی کریں ادب اسی وقت ترقی کرتا ہے جب زبان کی بنیاد مضبوط ہو اور اس کے چلن کو کوئی خطرہ نہ ہو اس کام میں بہت دیر ہو گئی اور بہت نقصان ہو گیا؛ مگر اب بھی پوری توجہ کی جائے تو کچھ ہو سکتا ہے بہت کچھ عمل اقدامات خود کرنے ہیں کچھ حکومت سے کرانے ہیں۔ اس کام میں اکاڈمی کی مدد ہر اردو دوست کا فرض ہے۔ اردو کی جو تہذیبی اور ادبی حیثیت اترپردیش میں ہے اسے ترقی دینے کے لئے اقتصادی پہلو کو بھی ذہن رکھنا پڑے گا اور اردو میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے مناسب روزگار مہیا کرنے کی سبیل بھی کرنی ہو گی۔ ایک طرف کام زیادہ سے زیادہ پھرتی سے ہونا چاہئے دوسری طرف پھرتی کی وجہ سے بڑے اور چھوٹے کام سب ایک ساتھ کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے بلکہ ترجیحات قائم کر کے کام کی اہمیت کے لحاظ سے اس پر پوری توجہ صرف کرنی چاہئے۔ بہرحال ہماری دعائیں اکاڈمی کے ساتھ ہیں مگر ہم عمل کو دیکھیں گے صرف وعدوں پر نہیں جائیں گے ہاں عمل کی دنیا میں نتائج کے ظہور کے لئے تھوڑا انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ ہم اکاڈمی کو موقع دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے قیام کا جواز پیش کر سکے۔

انعامی مقابلہ

نئی دہلی، نیشنل کونسل آف ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ نے ۵ سے ۱۴ سال تک عمر کے بچوں کے لئے کتابیں طلب کی ہیں۔ بچوں کے ادب کے لئے ۱۰ویں انعامی مقابلے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران شائع ہونے والی کتابیں اور مسودے شریک کئے جا سکتے ہیں۔

ایک ایک ہزار روپے کے پندرہ انعامات دیئے جائیں گے۔ ہندی کی دو کتابوں پر انعام ملے گا اور ایک ایک انعام ان زبانوں کی کتابوں پر دیا جائے گا۔ اردو، آسامی، بنگلہ، مرہٹی، اڑیہ، پنجابی، سندھی، تامل اور تلگو۔

ایک یا دو انعامات ایسے آرٹسٹوں کو دئے جا سکتے ہیں جنھوں نے انعام پانے والی کتابوں میں تصویریں بنائی ہوں گی۔

● قومی آواز لکھنؤ

متین سعید

تجریدی اور علامتی افسانہ

(ایک جائزہ)

اردو ادب کے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں اردو افسانہ نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اور دنیا کے افسانوی ادب میں اس نے اپنا ممتاز مقام بنالیا ہے۔ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اردو میں معیاری افسانوں کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے۔ ایسے افسانے تو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جنھیں ہم "شاہکار" کہہ سکیں۔

اردو افسانہ پر ابتدا ہی سے مقصدیت حاوی رہی ہے۔ مقصدیت بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ہے بشرطیکہ وہ ادب پر محدود اثرات ہی ثبت کرے۔ ہمارے یہاں مقصدیت ادب پر حاوی ہوگئی ہے۔ اور اس نے فن کی روح کو مجروح کردیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں اردو افسانہ نے فنی اعتبار سے ترقی ضرور کی لیکن وہ بیشتر سیاسی نظریات کی تبلیغ کا ذریعہ ہی بنا رہا۔ یوں تو ترقی پسند تحریک کے آغاز سے بہت قبل ہی "مقصدیت" کا زہر اردو شعر و ادب کی رگوں میں سرایت کرچکا تھا۔ مقصدی یا افادی ادب اور غیر نظریاتی ادب میں واضح فرق رہا ہے۔ اگر ہم اپنے افسانوی ادب کو "نظریاتی" اور "غیر نظریاتی" کے خانوں میں تقسیم کرکے اس کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ہماری بیشتر معیاری تخلیقات غیر نظریاتی ادب کے دائرہ میں شامل ہوتی ہیں۔

بعض دیگر اصناف کی طرح، مختصر افسانہ بھی ہم نے مغرب سے "درآمد" کیا ہے۔ افسانہ نگاروں نے نہ صرف ہئیت اور تکنیک میں مغربی تخلیقات کی پیروی کی، بلکہ اکثر خیالات اور پلاٹ بھی مغرب سے مستعار لئے۔ ایسے افسانوں میں تخلیقی عمل کا منفرد تنوع اور تازگی مفقود ہیں۔ مغربی افسانہ، ایک مخصوص ماحول اور مزاج کا ترجمان ہے، جس کا تعلق ہمارے ماحول اور مزاج سے بالکل نہیں ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے ایسے افسانے ہمیں "اجنبی" سے محسوس ہوتے ہیں جن میں مغرب کی پیروی کی گئی ہے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے کامیاب افسانے اس وقت تخلیق کرنا شروع کئے، جب انھیں اپنے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

"شعور کی رو" کی دریافت نے افسانہ کی ہئیت اور تکنیک سے متعلق بنیادی تصورات کو یکسر بدل ڈالا۔ علم نفسیات نے انسانی ذہن اور فطرت کی پیچیدگیوں کو بے نقاب کیا۔ اردو افسانہ پر بھی اس کا اثر پڑا۔

آزادی کے بعد، افسانہ میں سب سے اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ وہ "نظریات" کی حدود سے باہر نکل آیا۔ اور بیشتر افسانہ نگاروں نے کسی طرح کی نظریاتی وابستگی قبول کرنے سے انکار کردیا۔ کہانی "سوچے سمجھے نتائج" کے حصار سے باہر نکل آئی۔ نئے افسانہ میں بنیادی اہمیت "فرد" کو دی جانے لگی۔ اور بجائے "طبقہ" کے کردار پر زور دیا جانے لگا۔ اس طرح ہمارے افسانہ نگاروں نے زندگی کے غیر مرئی، لیکن زیادہ حقیقی خدوخال اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ایسے افسانہ نگاروں میں رام لال، جوگندر پال، ستیش بترا، اقبال متین، رتن سنگھ، اور اقبال مجید وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

"علاقائی افسانہ" کا رجحان بھی آزادی کے بعد تیزی سے ابھرا۔ مثلاً بلونت سنگھ نے پنجاب کی زندگی سے متعلق، قاضی عبدالستار نے اتر پردیش کے جاگیردارانہ ماحول سے متعلق اور غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی نے بہار کے تمدن سے متعلق افسانے تخلیق کئے۔ جیلانی بانو اور واجدہ تبسم نے حیدرآباد کے جاگیردارانہ تمدن کو اپنے افسانوں کا مرکزی موضوع بنایا۔

آزادی کے بعد تجریدی اور علامتی افسانہ نے مقبولیت حاصل کی۔ یہ رجحان، آج ہمارے ادب پر حاوی نظر آتا ہے۔ ایسے افسانوں میں "اشاریت" اور "علامات" کو باقاعدہ ذہنی سطح پر استعمال کیا جاتا ہے۔ نئے دور میں "اشاراتی" انداز، ادب میں تمام اصناف میں اہمیت حاصل کررہا ہے۔ یہ تہذیبی ارتقار کا ردعمل ہے۔ اب سیدھی سادی کہانیوں میں جاذبیت باقی نہیں رہی۔ محبت کا وہ رومانی تصور، جو آزادی سے پہلے ہمارے ادب پر حاوی رہا، اب اس کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ اس لئے کہ موجودہ مشینی عہد میں، وہ خوابناک فضائیں بکھر کے ریزہ ریزہ ہوچکی ہیں۔ عشق جیسے جذبات اب مہمل اور بے معنی سے محسوس ہوتے ہیں۔

آیئے، اب ہم دیکھیں کہ علامتی افسانہ کیا ہے؟ علامتی افسانہ کی اہم ترین انفرادیت یہ ہے کہ وہ "منطقی" نہیں ہوتا۔ اس میں ٹھوس ہونے کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی، جو روایتی افسانہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں زمان و مکاں کا واقعاتی احساس بھی نہیں ملتا بلکہ زمان و مکاں دونوں ذہنی تجربے کی سطح پر واقع ہوتے ہیں۔ پلاٹ میں اچانک تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ آغاز اور انجام پر زور نہیں دیا جاتا بلکہ احساسات کے خاکے، غیر منظم انداز میں پیش کردینا ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس میں ٹھوس کرداروں کی بجائے تمثیلیں اور علامتیں، کہانی بیان کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ علامت، جو استعارہ کی وسیع تر شکل ہے، معنوی تہ داری پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور علامتوں کے حسی پیکر سے وہ تمام نقوش اجاگر کئے جاتے ہیں جو ذہن کی تہوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ان افسانوں کا تعلق، محض حسیاتی کیفیات ہی سے نہیں ہوتا، بلکہ لاشعور کی پیچیدگیوں سے بھی

ہوتا ہے جن پر روشنی ڈالنے کی کوشش اس سے پیشتر نہیں کی گئی ہے۔

ایسے افسانوں میں مخصوص الفاظ، علامات بن کر ایک خاص طرح کی معنویت اور وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ تجریدی افسانہ عصری ادب کی دیگر اصناف کی طرح، فرد کی ذات کے اس سفر کی نشاندہی کرتا ہے جس کا رخ "خارج" سے "باطن" کی طرف ہے۔ اس میں انسان کے ذہنی مسائل، اس کا داخلی کرب اور حقیقت کے عرفان کی تلاش کا اظہار نمایاں ہوتا ہے۔ علامتی اور تجریدی افسانہ میں معنویت کی سطح، عام سطح سے اونچی ہوتی ہے کیونکہ اس میں الفاظ کے لغوی معنی ہی کی طرف اشارہ نہیں ہوتا۔ قاری کی ذہنی استعداد اگر اسے لغوی معنی سے آگے، علامتی معنی تک لے جانے میں ناکام ہو، تو قاری کو تجریدی افسانہ ایک معمہ کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ علامتی شاعری کی طرح علامتی افسانہ میں بھی ترسیل اور ابلاغ کا مسئلہ برابر قائم رہتا ہے۔ اگر ہم تجریدی اور علامتی افسانہ کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھیں کہ لفظوں کے منطقی اور لغوی معنی کے علاوہ ان کا کچھ اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے، تو ایسے افسانوں سے لطف اندوز ہونا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

تجریدی اور علامتی افسانہ تخلیق کرنے کے کامیاب ترین تجربے انتظار حسین، دیویندر اسر، بلراج مینرا، عبد اللہ حسین، انور سجاد، سریندر پرکاش، بلراج کومل، احمد ہمیش، کمار پاشی، خالدہ اصغر اور غلام الثقلین نے کئے ہیں۔

علامتی اور تجریدی افسانہ میں جو ایک طرح کی یاسیت، شکست خوردگی اور مایوسی کی فضا ملتی ہے، اس کا تعلق "وجودیت" سے اتنا نہیں ہے، جتنا ملک کے ان مخصوص حالات سے، جنھوں نے وجودیت کے فلسفہ کو ہمارے ادب کا مرکزی نظریہ بنا دیا ہے۔ اس دور میں زندگی کی معنویت کی تلاش اور وجود کی غرض و غایت کو سمجھنا باشعور انسان کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ تجریدی افسانہ میں اس مسئلہ کا غیر مرئی روپ نظر آتا ہے۔ تجریدی افسانہ اس نئے انسان کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جس کے لئے وجود کی معنویت، سب سے بڑا سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے!

اعزاز افضل

غزل

خواب زاروں میں لگی جب آگ ہر گام لگے
کس کے دامن پہ ہوا دینے کا الزام لگے

ہم کو کیا کیا تھے شب تشنہ لبی سے شکوے
لگ گئی آنکھ تو ہونٹوں سے کئی جام لگے

راہ میں سوکھے ہوئے پیڑوں کی اشتہری بہار
ہر طرف خانہ خرابوں کو در و بام لگے

منتقل ہوتے رہے ہر نئی تحویل میں ہم
بولیاں بولی گئیں روز نئے دام لگے

سر اٹھائے کوئی میں دار پہ کھینچا جاؤں
زندگی جرم کرے اور مرا نام لگے

جیسے جذبات میں گھمسان کے دن پڑتے ہوں
چوب نقارۂ دل پر سحر و شام لگے

فکر پروردۂ آغوش زمیں ہے لیکن
میرے الفاظ میں ڈھل جائے تو الہام لگے



ادب اور سرکاری سرپرستی

(ہماری زبان کے قارئین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں اس تقریر کے خلاصہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو جناب جی۔ایس کھوسلا نے ڈبلن میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی پی۔ای۔این کانگریس میں انڈین پی۔ای۔این سینٹر کے ہندوستانی نمائندہ کی حیثیت سے ادب اور سرپرستی کے موضوع پر کی تھی۔ ادارہ)

آج یہاں ادب اور سرپرستی کے دو پہلوؤں پر بحث ہوئی۔ ایک تو سرکاری سرپرستی دوسری اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور عام قارئین کی سرپرستی جس کو میرے پیشرو قابل مقرر نے بازاری آدمی کی سرپرستی سے تعبیر کیا ہے میرا خیال ہے کہ ہم ادیب لوگ بہرحال ایک بات پر تو ضرور متفق ہیں اور وہ یہ کہ کوئی ادیب بغیر سرپرستی کے ابھر نہیں سکتا۔ اگرچہ انسان کی زندگی کا انحصار صرف ذریعہ معاش پر نہیں ہے مگر بخلاف اس کے ادیب و مصنف کی زندگی کا انحصار زیادہ تر اسباب معاش پر ہی ہوتا ہے اس لئے ایک مصنف کی تخلیقات کو ایسے قارئین کی ضرورت ہے جو اس کی کتابوں کو خریدتے رہیں چنانچہ میں جو خیالات یہاں پیش کرنے والا ہوں وہ زیادہ تر ادب کی سرکاری سرپرستی سے متعلق ہوں گے۔

پرانے زمانہ میں ادب کی سرپرستی ہندوستان میں بادشاہوں اور شہنشاہوں کی طرف سے ہوتی تھی۔ بہت سے بڑے بڑے شاعر اپنے شاہی سرپرستوں کی مالی امداد پر زندگی بسر کرتے تھے۔ مغل شہنشاہیت کے دور حکمرانی میں سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک شاعری کی اتنی زیادہ قدر و منزلت ہو گئی تھی کہ بادشاہ اور شہزادے بھی شعر کہنے اور مشاعروں میں شریک ہونے کو عزت و افتخار کا باعث سمجھتے تھے تاہم یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ حکمران اپنی سرپرستی یا زندگی بھر کا وظیفہ معاش کسی شاعر کو اس وقت تک نہیں عطا کرتے تھے جب تک وہ اپنے فن میں نمایاں اور امتیازی مقام حاصل نہ کر لیتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ایسی سرپرستی معمولی اور سطحی شاعروں اور ادیبوں کو اپنے فن کے ذریعہ روزی کمانے میں ممد و معاون نہیں ہوتی تھی۔

آجکل ان شاہی سرپرستوں کی جگہ ریاستی حکومتوں کے منتخبہ وزراء نے لے رکھی ہے جو اصلیت میں سیاست داں ہوتے ہیں۔ اس لئے اب ایسے واضح، معین اور معروضی اصول نہیں رہے جن کی بنا پر کسی فن کی ادبی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اب لازمی طور پر ایسے ادیبوں اور شاعروں کو جو حکومت وقت کے شعبہ اور مسلمہ مقاصد کی ترجمانی کو پروان چڑھا سکیں وزراء کی سرپرستی حاصل کرنے کے زیادہ مواقع حاصل ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات بذات خود ایسا بڑا عیب نہیں مگر ایسی صورت میں جو رجحان کچھ ادیبوں میں اپنے فن کو سیاسی سرپرستوں کے میلان طبع کے اظہار اور اپنے مخصوص مفاد کے حصول کا ذریعہ بنانے کا پیدا ہو جاتا ہے اس سے معیار اس درجہ بگڑ جاتا ہے کہ اچھے اور برے میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے بلکہ ایسے نئے ادب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے غلط قسم کے معیار قائم ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان کو آجکل بہت سے سیاسی اور سماجی مسائل کا سامنا ہے۔ ان کو حل کرنے کے لئے ادیبوں کی خدمات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ ان مسائل کو عوام کی نظر احتساب کے سامنے پیش کرنے کے لئے ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر پنجابی زبان میں لکھا ہوا میرا ڈرامہ "قیامت سے آگے" (BEYOND DOOMSDAYS) آبادی کے عالمگیر طور پر پھوٹ پڑنے کے مسئلہ کو فاش کرتا ہے۔ میں ادیب کا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ وہ ایسے سماجی مسائل کو فاش کر کے دکھائے اور ان سے متعلق عوام کی معلومات میں اضافہ کرتا رہے۔ لیکن اس ادیب میں جو اپنی دیانت داری سے مصالحت کئے بنا دلی لگن کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور اس ادیب میں جو مالی منفعت یا حکومت کی خوشنودی کے حصول کے لئے لکھتا ہے بڑا فرق ہے۔

ماضی قریب میں ہندوستان کو جن سیاسی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان میں سے ایک اس کے علاقہ پر ۱۹۶۲ء میں چین کا جارحانہ حملہ بھی تھا۔ اس ہنگامی زمانہ میں بہت سے شاعروں نے عوام کے احساس کو بیدار کرنے، ان میں جذبۂ اتحاد پیدا کرنے اور اپنی مسلح افواج کو ملک کی سرحدوں کے تحفظ پر اکسانے کے لئے حب الوطنی سے بھرپور بہت سی نظمیں لکھیں۔ یہ مقاصد قابل داد ہیں۔ سرکار کی طرف سے ایسی نظموں کی ہمت افزائی کی کوششوں پر یا ایسے شاعروں اور ادیبوں پر جو محض حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں کوئی اعتراض کی گنجائش نہیں لیکن جب ایسی ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں شاعروں کو ملک الشعراء جیسے خطابات ملنے لگیں تو یہ احساس ہونا لازمی ہے کہ اب ادبی اقدار معرض خطر میں ہیں بدقسمتی سے ہندوستان کا ادب آجکل ایسے ہی حالات سے دوچار ہے۔

اس صورت حال میں ادب پابند ادبی افکار میں تھوڑا ہی فاصلہ ہے یعنی ایسی صورت میں پیشہ ور سیاستداں اور پیشہ ور شہری حکام کی قسم کی ادیبوں کی ایک نئی نسل وجود میں آ جاتی ہے۔ ایک ادیب کو اپنے نصب العین سے وابستگی جس کی وہ ایمانداری اور دلی ایقان کے ساتھ حمایت کرتا ہے

انسانیت، عالمی برادری اور ایک انسانی دنیا کے تصور سے وابستگی کے مترادف ہے اور یہ قطعی جائز ہے لیکن ادیب کی کسی عارضی مقصد یا ذاتی معاشی مفاد سے وابستگی اس کی تصنیفات کے لئے کسی طرح سودمند نہیں اور نہ اس سے تصنیف و تالیف کے پیشے کو رفعت حاصل ہو سکتی ہے۔

سرکاری سرپرستی کی ایک اور نمایاں مثال مصنفین سے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے لئے جلد بازی میں کتابیں لکھوانا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہندوستان میں پڑھے لکھے عوام کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور جو کچھ ہیں وہ بھی متعدد لسانی حلقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں سولہ بڑی زبانیں ہیں اور رابطہ کی زبان انگریزی اور ہندی کو چھوڑ کر ان زبانوں کے پڑھنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے نصابی کتابوں کے لکھنے کی ہدایت سے ان کی فروخت پر بھی خاصہ اثر پڑتا ہے نصابی کتابوں کے انتخاب میں اکثر جانب داری اور اقربا پروری سے کام لیا جاتا ہے اب اس قسم کے اعتراضات سے بچنے کے لئے کچھ یونیورسٹیوں میں تشخیص اور چھان بین کے اصول کے ماتحت ایسی کتابوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کو مصنف یا ناشر اس مقصد کے لئے پیش کرتے ہیں۔ حساس مصنفین ایسے ججوں کے سامنے اپنی کتابیں پیش نہیں کریں گے جن کی قابلیت و صلاحیت خود مشتبہ ہو۔ یہ ایسا معاملہ ہے جہاں سرکاری سرپرستی مصنفین کو ان کے اس مفاد سے محروم کر سکتی ہے جو ان کا جائز حق ہے۔

میں یہ تاثر پیدا کرنا نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں سرکاری سرپرستی ایک بڑا عیب ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں کتابوں کی اشاعت کے لئے حکومت ہند نے ایک بڑی رقم مخصوص کر رکھی ہے جو نئی شائع شدہ کتابوں کی خریداری پر صرف کی جاتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت بہت سی ایسی کتابیں بالخصوص تراجم پر مشتمل کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو حکومت کی امداد کے بغیر منظر عام پر نہیں آ سکتی تھیں۔

چنانچہ اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ سرکاری سرپرستی نے تصنیف و تالیف کے کام کو کسی حد تک فائدہ پہنچایا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس سے بڑی حد تک غلط قسم کی ادبی اقدار کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ اس کو میں اعلیٰ پایہ کے تخلیقی ادب کی آزادانہ رفتار ترقی کے لئے ممد و معاون نہیں سمجھتا۔

آخر میں میں اتنا کہنا اور چاہتا ہوں کہ مجھ کو ممالک متحدہ امریکہ کے تھوماس فلیمنگ سے بالکلیہ اتفاق ہے کہ پی۔ ای۔ این کو مصنفین کی قابلیت اور ان کی تخلیقات کی قدر و قیمت کی تشخیص کے لئے کچھ معیار مقرر کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اور میں ان کی اس تجویز سے بھی متفق ہوں کہ پی۔ ای۔ این کو تراجم کے ایک عظیم منصوبے پر بھی جلد در آمد کرنا چاہئے جس سے ایشیائی ممالک کے ادب سے مغربی ممالک کو زیادہ سے زیادہ واقفیت بہم پہنچائی جائے اور ترقی یافتہ ممالک کے سرمایہ کے بہاؤ کا رخ ترقی پذیر ممالک کی طرف پھر جائے۔

رحمٰن جامی

ازل تا ابد

جب تمہیں دیکھا
مرے دل نے کہا
تم ہو حسیں
تم ہو مرے دل کے قریں
کتنے یگ بیت گئے
پھر تمہیں دیکھا
تو یہ دل نے کہا
تم سے مرا رشتہ ہے
میں نے قرنوں سے تمہیں چاہا ہے
اور اسی بات پہ برسوں مرے دل نے سوچا
کئی امیدیں کئی خواب، حسیں میرے خیال
تم سے وابستہ رہے
اور پھر کتنے ہی اٹھتے رہے رہ رہ کے سوال
جن سے دل ڈرتا رہا
کتنے یگ بیت گئے
اور اب میں نے تمہیں پایا ہے
اور اب تم ہو مری جانِ وفا
تم نے اب مجھ سے کہا
تم نے بھی چاہا تھا
چھپ چھپ کے مجھے قرنوں سے
تم نے بھی میری تمنا کی تھی
مجھ سے محبت کی تھی
اور اب پا کے تمہیں
سوچ رہا ہوں بس میں
جانے یہ کونسا یگ ہے جس میں
قرن ہا قرن میں دو جسم ملے ہیں آ کر
جانے یہ کونسا اپنا ہے جنم

مراسلات

غالب کا دوسرا خود نوشتہ دیوان؟

(۱)

"ہماری زبان" (۲۲ جنوری) میں جناب توفیق احمد قادری چشتی مالک نیشنل بکڈپو امروہہ کا مراسلہ بعنوان "غالب کے دوسرے خود نوشتہ دیوان کی دریافت" شائع ہوا ہے جس میں یہ ادّعا کیا گیا ہے کہ موصوف نے ایک اور دیوان بخطِ غالب دریافت کرلیا ہے اور یہ انھیں جناب محسن کاکوروی مرحوم کے خاندان سے ملا ہے۔ میں نے یہ مخطوطہ دیکھا ہے، اس کے بارے میں اہلِ ذوق کی اطلاع کے لئے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مرزا غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ اس پر کاتب کا نام سرے سے نہیں ہے اور خط کے انداز میں کوئی خفیف سی مماثلت بھی خطِ غالب کی نہیں ملتی۔ اس نسخے میں مرزا کا کوئی غیر مطبوعہ شعر بھی نہیں ہے۔ اس کی ترتیب دیوان غالب کے پہلے ایڈیشن کے مطابق ہے۔ شروع میں مرزا کا لکھا ہوا دیباچہ ہے اور آخر میں قطعات۔ بعض قطعوں پر فارسی میں ایک یا دو سطروں کے عنوانات بھی ہیں مگر یہ اتنا کرم خوردہ و بوسیدہ ہے کہ عنوانات کی پوری عبارت پڑھی نہیں جا سکتی۔ اس وقت میری دسترس میں پہلا ایڈیشن نہیں ہے اس لئے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ عنوانات اس میں موجود ہیں یا نہیں۔ مثلاً: "کلکتی ڈلی" والے قطعہ پر یہ عنوان ہے: "با دوست از سپاس عطاسی ہدیہ سخن راندن و متاع گزیدۂ سخن در برابر افشاندن۔" اسی طرح "کلکتے کا جو ذکر کیا" والے قطعہ کا عنوان ہے: "چمن آرائے کردن گفتار بہ ستایش کلکتہ کہ اگر فردوس . . . ." آگے کرم خوردہ ہے۔ تیسرا قطعہ جس کا پہلا مصرع ہے: "گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفا داری" اس پر لکھا ہے: "قطعہ در نمایش عنوان در آویزش گفتن دگذا و باز عیاں کردن اندوہِ پشیمانی بر دل" دیباچۂ دیوان کی عبارت وہی ہے جو عام طور پر معلوم ہے اور اس کے آخر میں تاریخ کتابت نہیں ہے۔ متن میں قابلِ ذکر اختلافات دو نظر آئے نسخۂ عرشی میں صفحہ ۱۲۱ کی پہلی سطر میں ہے "رخِ آتش بہ تسنیع برافروزندہ" اس نسخے میں "تسنیع" کی جگہ "طبع" ہے۔ دوسری سطر میں ہے "آتش پرست را بباد افراہ ہم بآتش" اس نسخے میں "افراہ" نہیں "افواہ" ملتا ہے۔ باقی اختلافات بہت ناقابلِ التفات ہیں۔

مختصر یہ کہ اس نسخے کی اہمیت بس اتنی ہے کہ یہ دیوانِ غالب ہے، قلمی ہے، کرم خوردہ ہے اور اگر زیادہ دیدہ ریزی سے بحث کی جائے تو جس طرح اصلی دیوان بخطِ غالب کا پایۂ استناد مشتبہ ہو گیا تھا، کچھ مشکل نہیں ہے کہ اس کو بخطِ غالب ثابت کیا جا سکے اور اب تو یہ بھی کوئی اہمیت کی بات نہیں رہی اس لئے کہ یہ اہلِ علم میں بھی تفریح کا موضوع بن چکا ہے اور بعض کو مدت تک سے خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ پرانے بستوں میں غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دیوان نکلنے شروع ہو گئے ہیں مگر بقول غالب مرحوم کہ خود کو سانِ آنجہ کہتا تھا:

اوّلِ ما آخرِ ہر منتہی
آخرِ ما جیبِ تمنا تہی!

لاموجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔ اللہ بس ماسوی ہوس۔

دلّی کالج دلّی ۶ — نثار احمد فاروقی

(۲)

جناب توفیق احمد قادری چشتی کو غالب صدی (۱۹۶۹ء) میں غالب کا خود تحریر کردہ دیوان دستیاب ہوا تھا، یہ بعد کو "دیوان غالب بخطِ غالب" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کو ہی غالب کا ایک اور نیا دیوان، خود غالب کے خط میں چھپا ہوا ہے۔ اس کی اطلاع ہفتہ وار "ہماری زبان" علی گڑھ، شمارہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۲ء میں تفصیل سے درج ہے۔ یہ نیا دیوان توفیق احمد کے بیان کے مطابق ۳۳ اوراق کا ہے؛ اور کرم خوردہ ہے۔ یہ مشہور شاعر علامہ محسن کاکوروی کے پوتے سے ۱۲ جنوری ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ میں حاصل ہوا۔ (یہ توفیق صاحب پرانی کتابوں اور قلمی کتابوں کے تاجر ہیں)

حیرت کا مقام یہ ہے کہ ۲۲ جنوری ۷۲ء کو ہی کسی ایم۔ اے خان معتمد (معتمد؟) سکریٹری ادبی مجلس رام پور کے حوالے سے ایک خبر (یو۔ این۔ آئی) کے ذریعے "نیشنل ہیرلڈ" اور کچھ دوسرے انگریزی اور اردو اخباروں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ میں (ایم۔ اے۔ خان) اپنے دادا صاحب کے کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا، اس میں سے مجھے ایک دیوان غالب کے ہاتھ کا تحریر کیا ہوا ملا ہے۔ اس میں ۳۳ اوراق ہیں اور یہ کرم خوردہ ہے۔ چونکا دینے والا خیال یہ ہے کہ ہر دو صاحب کے پاس ۳۳ اوراق کے دیوان ہیں اور دونوں ان کو کرم خوردہ ظاہر کرتے ہیں۔

میں نے دوسری اطلاع کی تحقیق کے خیال سے رام پور میں ایم۔ اے خان کی تلاش کی اور ادبی مجلس رام پور کے دفتر کو بھی تلاش کیا۔ لیکن کوئی ایسا شخص انتہائی کوشش کے باوجود سامنے نہیں آسکا، جو اپنے آپ کو ایم۔ اے۔ خان کہلاتا ہو اور ادبی مجلس رام پور کا سکریٹری ہو، اور اس کو غالب کا تحریر کردہ دیوان حاصل ہوا ہو۔ ادبی مجلس رام پور کا کوئی وجود بھی دریافت نہیں ہو سکا۔ رام پور میں اس نام وادارے کے زیر اہتمام کوئی ادبی تقریب بھی آج تک منعقد نہیں ہوئی ہے

ہر ادبی آدمی اس نام اور ادارے سے واقفیت میں لاعلمی بھی رکھتا ہے۔

البتہ دونوں خبروں کا تجزیہ کرنے سے یہ خیال بڑی حد تک تقویت پاتا ہے کہ غالباً توفیق احمد قادری چشتی پروپرائٹر نیشنل بکڈپو امروہہ کو جو نیا دیوان ۱۲ رجنوری ۱۹۷۲ء کو ملا ہے، اس کی اطلاع کسی ایسے شخص کو مل گئی ہے، جو توفیق احمد سے اختلاف رکھتا ہے اور اس نے ایک فرضی نام و نشان (ایم۔ اے خاں معتمد سکریٹری ادبی مجلس رام پور) کی حیثیت میں یہ اطلاع یو۔ این۔ آئی خبر رساں ایجنسی دہلی کے سپرد کردی، تاکہ توفیق احمد کے اس نئے دیوان کی دریافت کا مسئلہ ایک پیچیدہ یا نہ سمجھ میں آنے والی صورت اختیار کرلے؛ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہاں (رام پور میں) ایم۔ اے خاں خود کو ظاہر کرنے میں کیوں گریز کر رہے ہیں؟

رامپور۔ • دور آفریدی

اردو کا ریفریشر کورس

(پرائمری اور جونیئر ہائی اسکول کے استادوں کے لئے)

اردو اکاڈمی، اترپردیش کے افتتاح کے وقت بڑے وزیر شری کملاپتی ترپاٹھی جی نے جو تقریر کی ہے اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ سرکار اردو کے لئے عملی طور پر کچھ نہ کچھ فوراً کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ پرائمری درجات میں اردو کی تعلیم کا ہے۔ اردو میڈیم پرائمری اسکولوں میں جو استاد اردو پڑھاتے ہیں وہ اردو کے طریقہ تعلیم سے نابلد ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک نارمل اسکولوں میں اترپردیش میں اردو پڑھائی جاتی تھی اور سی۔ ٹی۔ سی کے نصاب میں اردو کا طریقۂ تعلیم شامل تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس زمانہ کی ٹریننگ حاصل کئے ہوئے پرائمری کے استادوں کی تعداد آجکل بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۷ء سے اب تک مادری زبان پڑھانے کے طریقۂ کار کے متعلق بہت سی نئی مفید معلومات جمع ہوگئی ہیں۔ لیکن ہمارا اردو کا استاد ان سے بے بہرہ ہے۔ کافی وقت ضائع ہو چکا ہے۔ اس لئے اگر اردو اکاڈمی فوری طور پر اس سلسلہ میں ضروری کاروائی کرے اور حکومت کے محکمۂ تعلیم کو مشورہ دے کہ وہ پرائمری اور جونیئر ہائی اسکولوں کے استادوں کے لئے اردو ریفریشر کورس شروع کرنے کا فوری اقدام کرے تو مناسب ہوگا۔ اس ریفریشر کورس کا ایک خاکہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اس کی مدت تین ماہ کی ہوگی۔ یہ ریفریشر کورس ان آٹھ ضلعوں میں سے جہاں اردو والوں کی تعداد پندرہ فیصدی یا اس سے زائد ہے کسی ایک ضلع کے نارمل اسکول میں کیا جاسکتا ہے۔ پرائمری کے استادوں کے ساتھ ساتھ جونیئر ہائی اسکولوں کے اردو پڑھانے والے استادوں کا بھی ایک علحدہ ریفریشر کورس منعقد کیا جاسکتا ہے۔

کورس کی مدت: پہلا دور، مارچ ۷۲ء سے مئی ۷۲ء تک۔ دوسرا دور، جولائی ۷۲ء سے ستمبر ۷۲ء تک۔ تیسرا دور، اکتوبر ۷۲ء سے دسمبر ۷۲ء تک۔ اگر ضرورت ہو تو ۱۹۷۳ء میں بھی یہ سلسلہ قائم رکھا جاسکتا ہے۔

مضامین تقریری۔ اصول تعلیم۔ بچوں کی نفسیات۔ اردو پڑھانے کا طریقہ تعلیم، اسباق پریکٹس۔ کم از کم پندرہ سبق (نگرانی کے ساتھ)

کتب جن سے مدد لی جاسکتی ہے:-

(۱) بنیادی استاد کے لئے از ڈاکٹر سلامت اللہ مطبوعہ مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی۔

(۲) ہم کیسے پڑھائیں از ڈاکٹر سلامت اللہ مطبوعہ مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی۔

(۳) اصول تعلیم (متعلقہ ابواب) از ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔

(۴) پرائمری کے مدرسین کے لئے ہدایات مولفہ خلیل الرب شائع کردہ محکمہ تعلیم۔ یو۔ پی

(۵) تعلیم کے نئے اصول اور دیگر مضامین۔ مصنفہ مبشر علی صدیقی مطبوعہ "رہنمائے تعلیم"۔ دہلی

(۶) مادری زبان پڑھانے کے لئے اشارات (اردو ایڈیشن) از ڈبلو۔ ایم۔ رائبرن مطبوعہ اکسفورڈ یونی ورسٹی پریس بمبئی کلکتہ

(۷) اردو کیسے پڑھائیں؟ از مولوی سلیم اللہ مطبوعہ چمن بکڈپو اردو بازار، نئی دہلی۔

(۸) ابتدائی علم النفس: از پی۔ این۔ جھا مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد۔

بدایوں۔ • مبشر علی صدیقی

انجمن کی خبریں

روشؔ صدیقی مرحوم کی پہلی برسی

۲۲ جنوری کی شام کو روشؔ صدیقی مرحوم کی پہلی برسی پر انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک نشست جناب خواجہ احمد فاروقی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ نشست کا آغاز اس غزل سے ہوا جو شاہ جہاں پور کے مشاعرہ میں ایسی حالت میں مرحوم شاعر نے پڑھی تھی کہ سینے میں درد ہو رہا تھا اور شدید سردی میں بھی پسینہ آ رہا تھا۔ اس غزل کا پہلا شعر ہے ؎

بوالہوس تجھ کو کون سمجھائے
زندگی دردِ ناتمامی ہے

اور مقطع ہے۔

اے روشؔ کون اس صنم سے کہے
خلق مشتاقِ ہمکلامی ہے

اور وہ اشتیاقِ ہمکلامی میں اس عالمِ فانی سے دور بہت دور چلے گئے۔

جناب مالک رام صاحب نے اپنی عالمانہ تقریر کے آغاز میں فرمایا کہ روشؔ کی رسمی تعلیم زیادہ نہیں تھی لیکن ان کا مطالعہ کافی تھا۔ اس لئے ان کے کلام پر فارسی شعراء کا اثر ہے۔ جو چیز ان کی مجھے بہت پسند آئی وہ ان کی نیکی تھی۔ شعرا میں ان کی مثال کم ملتی ہے۔ میرے ان سے ۲۵ برس کے تعلقات تھے۔ اپنے معاصرین میں ان کو میں نے کسی کو برا کہتے نہیں سنا۔ وہ نہایت خوددار اور قانع انسان تھے۔ کلام کے لحاظ سے وہ چوٹی کے شعراء میں تھے ان کے ذاتی کردار کا اثر ان کے کلام پر بھی ہے۔

روشؔ نے ہندی گورو کل کانگڑی میں پڑھی اور ویدانت کا مطالعہ کیا اس لئے ان کے کلام میں ویدانت اور تصوف کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

مالک رام صاحب نے مرحوم کی شاعری پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہا کہ وہ کوئی اوچھی بات کبھی اپنی غزل میں نہیں کہتے تھے زبان کی صحت میں اگر ان کا کوئی حریف ہو سکتا ہے تو حسرتؔ ہے جوشؔ اور جگرؔ کے ہاں بھی زبان کی غلطیاں مل جاتی ہیں لیکن روشؔ کی شاعری اس سے محفوظ ہے اور یہ خوبی بھی ہے کہ ان کی زندگی کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی لیکن ان کے کلام میں مایوسی کہیں نہیں ملتی اس میں رجائیت اور ولولہ ہے

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ ندوۃ المصنفین ۱۹۳۸ء میں قائم ہوا اس کے کچھ ماہ بعد ہی روشؔ صاحب تشریف لائے اور برہان کے لئے اپنی غزل دی۔ اس کے بعد بھی برہان میں وہ اکثر اپنا تازہ کلام دیتے رہے ہیں۔ جوشؔ اور جگرؔ دونوں کی تعلیم کوئی اعلیٰ نہیں تھی لیکن ان کا فارسی ذوق اچھا تھا۔ روشؔ کی یہ خوبی قابلِ تعریف ہے کہ وہ بادہ خوار نہیں تھے مگر بادہ خوار رنگ کے شعر کہتے رہے۔

بسمل الٰہ آبادی، مولانا انور صابری، جناب مبارک علی عثمانی نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

صدرِ محترم نے آخر میں فرمایا کہ اس زمانے میں اردو کے چوٹی کے شاعر تھے جس دور میں روشؔ نے شاعری شروع کی لیکن بعض موضوعات پر انھوں نے جس انداز میں لکھا ہے کسی اور نے نہیں لکھا۔ ولیؔ اور حسرتؔ موہانی تک شعراء کا تعلق تصوف سے رہا ہے روشؔ کی شاعری میں بھی تصوف کا بڑا دل آویز امتزاج ہے میں نے انھیں ۱۹۳۲ء میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا اسی کیفیت میں آن کو عمر بھر دیکھا۔ وہ جب بھی نظر آئے تو شگفتہ۔ روشؔ کے مزاج میں بہت نفاست تھی ان کے ہر کام اور ہر بات میں گھر سے لے کر باہر تک نفاست پائی جاتی تھی۔ روشؔ کی بڑی خوبی ان کی خودداری اور نیک فطرت تھی۔ انھوں نے کبھی کسی کی غیبت نہیں کی اور ہمیشہ ہر مذہب کا احترام کیا۔ وہ گیتا کو "گیتا شریف" کہتے تھے۔

• نامہ نگار

تعزیتی قرارداد

انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کی مجلس عاملہ کے ایک جلسہ میں خواجہ غلام السیدین اور مولانا غلام رسول مہرؔ کے انتقال پر ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ ان دونوں حضرات کے انتقال کو انجمن اردو زبان اور برصغیر کی اردو دنیا کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان تصور کرتی ہے، ان دونوں عظیم ادبی و علمی شخصیتوں کی رحلت نے تحقیق اور تخلیق کے میدان میں ایک خلا پیدا کر دیا ہے، خواجہ غلام السیدین نے بالخصوص تقسیم وطن کے بعد ہندوستان کے نظامِ تعلیم میں ایک اہم رول ادا کیا۔ وہ ایک بلند پایہ مقرر، ادیب اور مصنف تھے ان کی وفات سے ہندوستان ایک ماہرِ تعلیم اور اردو زبان کے ایک ممتاز مصنف و محقق سے محروم ہو گئی ہے۔

مولانا غلام رسول مہرؔ برصغیر کے ایک نامور صحافی، ادیب، مورخ اور محقق تھے۔ غالبیات ان کا ایک خاص موضوع تھا اپنی علمی اور تحقیقی کاوشوں سے انھوں نے غالبیات میں گراں قدر اضافہ کیا۔

مجلس عاملہ کا یہ جلسہ ان دونوں عظیم شخصیتوں کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کے اظہار کے ساتھ دونوں مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

• انجمن ترقی اردو، دلی

اخبار و اذکار

اردو کی ترویج کے لئے از سر نو کام کا عزم

لکھنؤ۔ اردو اکیڈمی اتر پردیش کی مجلس عاملہ کے چیرمین پنڈت آنند نرائن ملا نے یہاں کہا کہ مارچ کے مہینے کے آخر تک اکیڈمی کچھ ایسے اقدامات کرے گی جس کا مطلب اردو والے طبقے کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ اکیڈمی ان کی واقعی خدمت کرنے کے ارادے سے بنائی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں امید ہے کہ حکومت ہمارے کاموں میں پورا پورا تعاون کرے گی۔

مسٹر ملا نے جو جلسے کے بعد اخباری نمائندوں سے بات چیت کر رہے تھے کہا کہ پچھلے ۲۵ برسوں سے اردو کو اس کے جائز حقوق دیے جانے سے انکار اور اردو دشمنی کا جو سرکاری رویہ رہا ہے اس میں ادھر دو برسوں سے تبدیلی آئی ہے اور اب ایسا لگتا ہے کہ حکومت ذہنی طور پر اردو دشمن نہیں ہے انھوں نے کہا لیکن میں ایک بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت کسی بھی مرحلے پر اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کو تیار نہیں ہے۔

اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب میں کچھ عرصہ قبل وزیر اعظم کو لے کر بمبئی ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہا تھا تو خود وزیر اعظم کا تاثر یہ تھا کہ اردو کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا گیا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ یو پی کی سرکار نے اردو اکیڈمی قائم کرکے اور ایک رقم مخصوص کرکے اردو کی ہمت افزائی کی ہے اور اب یہ کام اردو والوں کا ہے کہ وہ اردو کی خدمت کریں اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر حکومت کو قصوروار ٹھہرانا غلط ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ میرا نظریہ یہ ہے کہ حکومت صحیح طور پر اردو کی خدمت کرنے کو تیار ہے اس کے لئے اردو والوں کو اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ وہ اردو کو ہندی کی رقیب نہ بنائیں بلکہ ان سرکاری اعلانات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تگ و دو کریں جن پر عمل کرنے سے اضلاع کے افسران اور خصوصاً تعلیم کا محکمہ ٹال مٹول کرتا رہا ہے۔

مسٹر ملا نے کہا کہ ہم نے آج کے جلسہ میں بعض امور پر غور کیا اور یہ طے کرنے کے لئے کہ اپنے پروگرام کو شروع کرنے کے لئے کن کن باتوں کو اولیت دیں، ایک دو ذیلی کمیٹی مقرر کی ہے جس میں اکیڈمی کے چیرمین اور سکریٹری کے علاوہ مسٹر آل احمد سرور، ڈاکٹر محمود الٰہی اور قاضی جلیل عباسی ہیں۔

دوسری کمیٹی ایک رابطہ کمیٹی کا درجہ رکھے گی جو یہ دیکھے گی کہ اردو کی دوسری انجمنیں عوام کی کس حد تک خدمت کر رہی ہیں اس کمیٹی میں مسٹر عشرت علی صدیقی (اسسٹنٹ اڈیٹر قومی آواز) مسٹر ایس۔ ایم۔ جعفر اور چھیدی لال ساتھی ایم ایل سی ہوں گے۔

اس کے علاوہ ایک لائبریری کمیٹی ہوگی جو لکھنؤ میں ایک بڑی اردو لائبریری کے قیام اور اس کے لئے کتابوں کی فراہمی کا کام دیکھے گی۔ اس کام کے لئے ابتدائی اخراجات کے طور پر دس ہزار روپیہ کی ایک رقم منظور کی گئی ہے اور خود میں اپنی طرف سے اردو کی ایک ہزار کتابیں دوں گا اور دوسرے لوگوں سے بھی اس لائبریری کے لئے کتابوں کے عطیات کی اپیل کروں گا۔

ایک سوال کے جواب میں مسٹر ملا نے یہ تسلیم کیا کہ اکیڈمی کا کوئی دستور العمل ابھی مرتب نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے اپنے طور پر عام ممبروں کی تقرری کی اور مجلس عاملہ کے ممبران کا انتخاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے چیرمین مقرر کئے جانے سے قبل یہ کام ہو چکا تھا۔

اکیڈمی کے دائرہ کار سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ وہ متعین ہے اور اس کی تفصیلات اشاعت کے لئے جلد دی جائیں گی۔

انھوں نے نمائندہ قومی آواز کے استفسار پر بتایا کہ جنرل باڈی چالیس یا پچاس ممبران پر اور ۱۸ ممبران پر مجلس عاملہ مشتمل ہے اور آج کے جلسے میں ۱۵ ممبران شریک ہوئے۔

مصدقہ اطلاعات کے مطابق اردو اکیڈمی میں ممبران کا انتخاب کل تک ہوتا رہا اور بعض لوگوں کو آج کی مجلس عاملہ میں شرکت کرنے کی استدعا کے ساتھ ہی یہ اطلاع دی گئی ہے کہ وہ اکیڈمی کے بھی ممبر ہیں۔ اس طریقہ کار سے پتہ چلتا ہے کہ جس ایجنسی یا دفتر سے ممبران کے انتخاب کا کام ہوا اس نے انتہائی پھوہڑپن کا ثبوت دیا ہے۔

مسٹر ملا نے یہ بھی کہا کہ وہ خود کوئی تنخواہ نہیں لیں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ اردو کے کاموں ہی پر صرف ہو سکے۔

انھوں نے کہا کہ اکیڈمی کے صدر وزیر اعلا مسٹر کملا پتی ترپاٹھی ہیں اور نائب صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ ہیں۔

• قومی آواز لکھنؤ

اردو کے لئے سہولتوں کا وعدہ

فرقہ وارانہ منافرت کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر دفاع سردار جگجیون رام نے اپنی تقریر میں اردو کا خصوصیت سے ذکر کیا اور کہا کہ جو لوگ اردو پڑھنا چاہتے ہیں انھیں پوسٹ گریجویٹ درجوں تک اس کی تمام سہولتیں ملنی چاہئیں۔ • الجمعیۃ دہلی

اردو اکیڈمی کو آزاد اور فعال ادارہ ہونا چاہئے

لکھنؤ۔ پتہ چلا ہے کہ اردو اکیڈمی کی مجلس عاملہ کا جلسہ

۳۰/جنوری کو سوچنا کیندر لکھنؤ میں ہوا ہے۔ اس جلسہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ صوبہ میں اردو کو اصل مقام دینے کے لئے کون کون سے طریقے اختیار کئے جائیں گے جس سے اردو کی توسیع اور ترقی ممکن ہو سکے۔

یہ بھی پتہ چلا ہے کہ مجلس عاملہ کے چیرمین شری آنند نرائن ملا یہ چاہتے ہیں کہ اکیڈمی کو فعال اور متحرک بنانے کے لئے اکیڈمی کو وزیروں اور افسر شاہی کے دباؤ سے نکال کر ایک آزاد اور خود مختار ادارے کی حیثیت دی جائے تاکہ اکیڈمی ایمانداری سے اردو کی توسیع اور ترقی اور اس کی بہبود کے لئے کام کر سکے اور وہ مقصد پورا ہو سکے جس کے لئے اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اگر اس تجویز پر واقعی عمل کیا گیا تو اکیڈمی اردو کیلئے کچھ مفید کام انجام دے سکتی ہے۔

سیاست جدید

پروفیسر سید احتشام حسین کے اعزاز میں ادبی نشست

بمبئی: مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی میں اردو کے مشہور ادیب اور نقاد پروفیسر احتشام حسین کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں انھوں نے "اردو اور ہندی کے مسائل اور قومی یکجہتی" پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

انھوں نے اصل موضوع پر روشنی ڈالنے سے پیشتر اس بات کی وضاحت کی کہ میں جدید لسانیات کا ماہر نہیں ہوں۔ میں نے لکھنؤ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں بحیثیت ایک مستقل مضمون کے لسانیات پڑھانے کی ضرور ذمہ داری لی تھی اور اس سلسلہ میں کچھ کام بھی کیا ہے لیکن وہ محض ابتدائی قسم کا تھا کیونکہ اس وقت تک جدید لسانیات کا موضوع اتنا عام نہیں ہوا تھا جتنا آج ہے اس لئے میں اس موضوع پر لسانی سے زیادہ تاریخی اور سماجی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کروں گا۔

فاضل مقرر نے ہندوستان میں لفظ 'ہندی' کے استعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے تین دوروں کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ پہلے دور میں مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو نے اپنے بعض ہندی کلام کا ذکر کیا ہے لیکن شواہد کی غیر موجودگی میں یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندی سے ان کی کونسی زبان مراد ہے۔ دوسرے دور میں صوفیا نے بھی اپنے اکثر ملفوظات میں ہندی کا ذکر کیا ہے لیکن چونکہ ان کے ملفوظات بھی بیسیوں ہاتھ بدل کر مخطوطات کی شکل میں ہم تک پہنچے ہیں اس لئے ان کو دیکھ کر بھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کہ ہندی سے وہ کونسی زبان مراد لیتے ہیں۔ تقریباً یہی حال تیسرے دور کے کلاسیکی شعراء کا بھی ہے وہ بھی اپنے کلام کے لئے اکثر ہندی کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن یہاں بھی ثبوت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سے ان کی مراد کونسی زبان ہے۔

اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جن علاقوں کے یہ لوگ تھے وہ زیادہ تر دلی اور اس کے آس پاس کے تھے اس لئے وہ ہندی کہتے ہیں تو کوئی ایسی بولی مراد ہوگی جو دلی کے آس پاس رائج تھی جیسے کھڑی بولی۔ اٹھارہ سو عیسوی تک پہنچتے پہنچتے اس نے ایک مستقل زبان کی صورت اختیار کر لی تو اس کا نام اردو رکھ دیا گیا۔ یہ زبان موجودہ ہندی سے الگ ایک مستقل زبان ہے اور ایک قدرتی طریقے پر پروان چڑھ کر ہم تک پہنچی ہے۔

ہندی زبان پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ جس طرح اردو کے سلسلہ میں ہمیں ایک قدرتی ارتقا ملتا ہے وہ ہندی کے سلسلہ میں نہیں ملتا آج جس زبان کے لئے ہندی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ ناگری رسم خط میں لکھی ہوئی اردو ہے جس میں سے عربی، فارسی الفاظ نکال کر سنسکرت کے الفاظ رکھ دئے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ خود ہندی والے اس کی مکمل تاریخ کا پتہ پوچھو تو وہ یہ بتانے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن کمال ہوشیاری سے انھوں نے ہندی کی تعریف یا اس کے حدود ایسے مبہم بنائے ہیں کہ دلی اور یو پی کی ساری بولیوں کو اس میں سمیٹ لیا ہے اور خود اردو اور دکھنی کو بھی اسی کا شیلی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ اگر تحقیق ہم یہ مان بھی لیں کہ اردو کی طرح ہندی بھی ایک مستقل زبان ہے تو ایسی صورت میں انصاف یہی ہے کہ دونوں زبانوں کو پھلنے پھولنے کا برابر موقع ملے۔ ایک زبان کی قیمت پر دوسری کو ترجیح دینا نامناسب ہے۔

اردو اور ہندی کے مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل میں ان دونوں زبانوں کی کیا حیثیت ہوگی یہ اپنی اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گی یا ایک کا خاتمہ ہو جائے گا اور دوسری باقی رہ جائے گی۔ اس کا زیادہ تر دارومدار یہاں کے مستقبل کے سماجی ڈھانچہ پر ہوگا اگر ملک کی باگ ڈور ترقی پسند طاقتوں کے ہاتھ میں ہوگی، سیاسی اور معاشی میدانوں میں مساوات پر عمل ہوگا، فرقہ داریت کے زہر کو پھیلنے سے روکنے میں کامیابی حاصل ہو جائے گی تو پھر بہت ممکن ہے کہ یہ زبانیں بھی اپنی اپنی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے دوش بدوش ترقی پذیر ہوں گے۔

صدارت کے فرائض ادارہ کے مہتمم ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے انجام دئے اور حامد اللہ ندوی نے شکریہ ادا کیا۔

نامہ نگار

اسلوب احمد انصاری

میرا صفحہ

"ہماری زبان" مورخہ یکم اور ۸ دسمبر ۱۹۷۰ء میں کسی قدر تفصیل اور صفائی کے ساتھ اردو میں تراجم، ذریعۂ تعلیم اور اردو یونی ورسٹی کے قیام کے مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں اس رائے کا بھی اظہار کیا تھا کہ درسی اور عام دلچسپی کی معیاری کتابوں کو انگریزی زبان سے اردو میں ترجمے کے ذریعے منتقل کرنے کی نسبت یہ زیادہ مفید اور بار آور ہوگا، کہ مختلف موضوعات پر آزادانہ طور پر کتابیں تالیف کرائی جائیں۔ مزید یہ کہ تراجم اور تالیفات دونوں ہی کے سلسلے میں بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اصطلاحات علمیہ کی لغات فوراً شائع کی جائیں۔ ترقی اردو بورڈ کے قیام کو غالباً تین سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن ابھی تک ایسی کوئی لغت تیار ہو کر شرمندۂ اشاعت نہیں ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ منتظمین بورڈ کی کارکردگی پر اس سے خاصی روشنی پڑتی ہے۔ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ ہمیں بتدریج آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور جو بھی لائحۂ عمل ہم تجویز کریں، اس میں اس کا لحاظ رکھنا چاہئے یعنی یہ کہ جب تک ابتدائی اور ثانوی منزل پر تعلیم و تدریس کے لئے اچھے معیار کی کتابیں تیار ہو کر رواج نہ پا جائیں، کالج اور یونی ورسٹی کے طلبہ کے لئے کتابیں تالیف کرانے کے کام کا آغاز نہیں کرنا چاہئے۔

اسی سے منسلک مسئلہ جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، یہ ہے کہ کیا ہم ابتدائی اور ثانوی منزل پر لڑکوں اور لڑکیوں کو اردو پڑھانے کا انتظام بھی کر رہے ہیں یا نہیں؟ دلچسپ لیکن عبرتناک بات یہ ہے کہ جس بنیاد پر ہم پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں، وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، اور جس حد تک تھی بھی، وہ بھی آہستہ آہستہ ہمارے پاؤں تلے سے نکلتی جا رہی ہے۔ اردو کے سلسلے میں ہماری بیشتر سرگرمیاں اس بنیاد کے نہ ہونے کی وجہ سے گمراہ کن اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ پچھلے دنوں ترقی اردو بورڈ نے فن تنقید پر اردو میں کتابوں کے تراجم کا ایک لمبا چوڑا پروگرام بنایا تھا، جس میں کروشے سے لے کر رچرڈس اور بروکس تک، ہر قسم کی معیاری کتابوں کے تراجم کی سفارش کی گئی تھی۔ یہ پروگرام تو خاصا معقول اور مرعوب کن معلوم ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فی الوقت آپ طالب علموں کو اتنی اردو پڑھا بھی رہے ہیں کہ وہ ایم۔ اے کی منزل پر پہنچ کر ان ادق قسم کی کتابوں کو پڑھ کر اپنی گرفت میں لا سکیں۔؟ اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہے تو ان کتابوں کے تراجم سے کیے فائدہ پہنچے گا؟

اسی قسم کی ایک تجویز اردو اکاڈمی کا قیام بھی ہے جس کا باضابطہ اعلان یو۔ پی گورنمنٹ کی طرف سے کیا جا چکا ہے۔ اور جس کے نظم و نسق کے سلسلے میں اقدامات بھی کئے جا چکے ہیں۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اکاڈمی کے مقاصد میں اردو مصنفین کی ہمت افزائی کتابوں کی طباعت اور ان پر انعامات کی شکل میں کی جائے گی۔ بظاہر تو اس میں کوئی سقم نہیں معلوم ہوتا اور حکومت کی نیت پر شبہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن اکاڈمی کے قیام پر اظہارِ مسرت کرنے سے زیادہ کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے عہدیداران حکومت سے یہ مطالبہ کریں کہ ایسے اداروں کو قائم کرنے کی بجائے یو۔ پی کے مدارس میں اردو کی تدریس کے لئے ہمیں سہولتیں فراہم کی جائیں، اور اردو کو یو۔ پی میں سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ آخر اس طرح کے کھلونے دے کر ہمیں کب تک بہلایا جائے گا؟ جو لوگ اس قسم کے اداروں سے وابستہ ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ لمبی چوڑی تجویزیں پاس کرنے کی بجائے اور بھاری بھر کم علمی کتابوں کے تراجم کرانے کی تجویزیں پیش کرنے کی بجائے سارے صوبے اور سارے ملک میں اردو مکتبوں اور مدارس کا جال بچھا دیں، اور دوسری قومی زبانوں کو جو جو مراعات جس جس سطح پر حاصل ہیں اور جہاں جہاں وہ استعمال میں آتی ہیں انہی کے پہلو بہ پہلو اردو کے لئے بھی یہی سب کچھ دئے جانے کا مطالبہ کریں، بلند بانگ دعاوی کرنے اور حکومت کے الطافِ خسروانہ پر سر دھننے کی بجائے ایسے بنیادی کاموں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، جس سے اردو کی جڑیں پھیلیں اور اردو زبان کا چلن روزمرہ زندگی کے ہر شعبہ میں زیادہ سے زیادہ ہو۔

"ہماری زبان"

کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت اس بات کا خیال رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم۔ اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علیگڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ سے شائع کیا